بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اشارات

اس مہینے مسلمانوں کو دو ایسے زبردست حادثے پیش آئے ہیں جنھوں نے ان کی قومی زندگی کو صدمۂ عظیم پہنچایا ہے۔ اس لیے ہم اُس سلسلۂ کلام کو جو گذشتہ تین اشاعتوں سے ان صفحات میں چل رہا تھا، چھوڑ کر ان حوادث پر اور ان کے اثرات و نتائج پر اور اُن سے عہدہ برآ ہونے کی صورت پر کچھ گفتگو کریں گے۔

پہلا حادثہ بانی پاکستان مسٹر محمد علی جناح مرحوم کی وفات کا ہے۔ ان کی شخصیت پچھلے دس بارہ سال سے مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا مرکز و محور بنی ہوئی تھی۔ ساری قوم ان پر مجتمع تھی۔ ان کی رہنمائی پر سب کو بھروسہ تھا۔ انہی کے ذاتی اثر و رسوخ نے تمام مختلف عناصر کو جوڑ کر مسلمانوں کو ایک متحد قوم بنایا تھا۔ انہی کے اعتماد پر قوم نے اپنی پوری طاقت اس جدوجہد میں لگا دی تھی جس کے نتیجہ میں آخرکار پاکستان قائم ہوا۔ اور قیام پاکستان کے بعد اس نئی مملکت کی عمارت جس مضبوط ستون کے سہارے پر تعمیر ہو رہی تھی وہ بھی انہی کی جامع اور معتمد علیہ شخصیت تھی۔ ان کے بعد کوئی دوسرا شخص، بلکہ کوئی پورا گروہ بھی ہمارے درمیان ایسا موجود نہیں ہے جس سے لوگوں کو محبت ہو، جس کا احترام دلوں میں جاگزیں ہو، جس کے اخلاص اور تدبّر اور عزم و ہمت پر سب کو اعتماد ہو، جس کی آواز پر تمام قوتیں حرکت میں آجائیں، اور جس کی مقناطیسی کشش ہمارے شیرازۂ قومی کے مائل انتشار اجزاء کو باہم پیوستہ رکھ سکے۔ صرف ملک کے اندر ہی نہیں بلکہ ملک کے باہر بھی پاکستان کی جو کچھ ساکھ اور دھاک تھی وہ زیادہ تر اسی آزمودہ کار لیڈر کی بدولت تھی۔ کوئی دوسری شخصیت ہمارے ہاں ایسی نہیں ہے کہ اس کے وقار اور تدبر کو بین الاقوامی

برادری میں اس درجہ بھروسے اور اعتبار کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہو۔ دنیا کے لئے تو مرحوم کی وفات محض ایک بڑے انسان اور مشہور رہنما کی رحلت ہی ہے، مگر ہمارے لئے یہ ایک بہت بڑی قومی مصیبت ہے، کیونکہ اس سے ہماری نوخیز مملکت کی طاقت اور ہماری قومی زندگی کو ایسا صدمہ پہنچا ہے جس کی تلافی مشکل نظر آتی ہے، الا یہ کہ اللہ تعالیٰ ہی رحم فرمائے اور ہماری مدد کرے۔

"بے وقت موت" ایک ملحدانہ اصطلاح ہے۔ مسلمان کے نزدیک ہر موت ٹھیک اپنے وقت پر ہوتی ہے، اور خدا اس کا وقت کسی کے مشورے سے نہیں بلکہ اپنی حکمت اور مصلحت کے لحاظ سے مقرر کرتا ہے۔ ایک موت ہی پر کیا موقوف ہے، خدا کی اس خدائی میں جو کچھ بھی ہوتا ہے عین اپنے مناسب وقت پر ہوتا ہے اور اس وقت پر اس کے صدور میں وہ مصلحتیں ہوتی ہیں جن کو ہم نہیں سمجھ سکتے۔ البتہ جو بات ہم یقین کے ساتھ جانتے ہیں وہ یہ ہے کہ موت وحیات کا یہ سارا ہنگامہ ہماری آزمائش کے لئے ہے۔ خَلَقَ الْمَوْتَ وَالْحَیٰوۃَ لِیَبْلُوَکُمْ اَیُّکُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا۔ دنیا کا ہر واقعہ اور ہر حادثہ اپنے اندر خیر کا پہلو بھی رکھتا ہے اور شر کا پہلو بھی۔ انسان کی آزمائش اس میں ہے کہ وہ اس کی جانب خیر کو جذب کرتا ہے یا جانب شر کو۔ انفرادی حوادث میں افراد کی آزمائش ہوتی ہے اور قومی حوادث میں قوموں کی۔ جس شخص یا گروہ کا مزاج صالح ہوتا ہے وہ ہر تلخ و شیریں چیز اور ہر مرغوب و نامرغوب واقعہ سے اس کی بھلائیوں کو اخذ کرتا ہے اور اس کی برائیوں سے بچ نکلتا ہے۔ اس کے برعکس جس کے مزاج پر فساد کا غلبہ ہوتا ہے اس کو تلخی و شیرینی، نرمی اور سختی، راحت اور مصیبت، کامیابی و ناکامی، خوشحالی اور بدحالی، ہر چیز میں شر ہی کے پہلو ملتے ہیں اور ظاہری خیر کو بھی وہ اپنے لئے شر میں تبدیل کر لیتا ہے۔ پس درحقیقت ہماری قوم اس وقت آزمائش میں ڈالی گئی ہے۔ اس کو یہ امتحان درپیش ہے کہ وہ اس حادثۂ عظیم کو اپنے حق میں سبب خیر بناتی ہے یا وسیلۂ شر۔ اگرچہ دعا یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اس کے نقصانات سے بچائے، مگر دعا کے ساتھ خود ہماری اپنی کوشش بھی شرط ہے۔ خدا ہر ایک کو وہی کچھ دیتا ہے جس کے لئے اس نے سعی کی ہو اور جسے اخذ کرنے کی صلاحیت و استعداد وہ اپنے اندر رکھتا ہو۔

قائد اعظم کی وفات میں شر کے پہلو تو بے شمار ہیں جنہیں ہم میں کا ہر ایک چھوٹا اور بڑا اپنے اپنے تخیل کی وسعت کے مطابق محسوس کر رہا ہے۔ مگر اس مصیبت سے جو بھلائیاں ہم جذب کر سکتے ہیں ان کی طرف کم لوگوں کی توجہ منعطف ہوئی ہے۔

اولین چیز جسے ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان خوب ذہن نشین کر لیں وہ یہ ہے کہ ان کے بھروسے اور اعتماد اور تفویض و توکل کا اصل مرکز کوئی دنیوی طاقت نہ ہونی چاہیئے بلکہ صرف خدائے برتر کی ذات ہونی چاہیئے۔ اشخاص اور افراد ہوں یا قوی ذرائع و وسائل، بہرحال سب فنا پذیر ہیں۔ سب پر زوال آسکتا ہے اور اپنے وقت پر آجاتا ہے۔ جو قوم اس قسم کے سہاروں پر جئے گی اس کی اپنی زندگی بھی اتنی ہی ناپائدار ہوگی جتنے اس کے سہارے ناپائدار ہیں۔ ہماری قومی زندگی کے لئے اگر کوئی مستقل اور امٹ اور اٹل بنیاد ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہ کہ ہم اس خدا سے اپنا تعلق مضبوط کریں جو غیر فانی اور لازوال ہے یہی وہ حقیقت ہے جو حضرت ابوبکر صدیق نے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات پر اپنے مشہور خطبہ میں مسلمانوں کو یاد دلائی تھی کہ من کان یعبد محمداً فان محمداً قد مات ومن کان یعبد اللہ فان اللہ حی لا یموت، یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم جس کے معبود تھے اس کا دل تو واقعی ٹوٹ ہی جانا چاہیئے کیونکہ اس کا بھروسہ ایک فانی معبود پر تھا جو دنیا سے رخصت ہو گیا، مگر جس کا معبود خدا تھا اس کا دل ٹوٹنے کی کوئی وجہ نہیں، کیونکہ خدا زندہ ہے اور وہ بہرحال کبھی مرنے والا نہیں ہے۔

تعلق باللہ کے بعد دوسری چیز جو ہماری قومی زندگی کے قیام و استحکام اور ترقی و سربلندی کے لئے مضبوط سہارا بن سکتی ہے وہ ایک اونچے نصب العین کی محبت، ایک پاکیزہ مقصد حیات کا عشق، اور ایک اصولی نظام سے قلبی اور عملی وابستگی ہے۔ اشخاص و افراد بلاشبہ اجتماعی زندگی میں اپنی ایک فطری اہمیت رکھتے ہیں۔ پراگندہ قوموں کو جوڑ کر متحد کرنے اور انہیں پستی سے اٹھا کر ترقی کی راہ پر لگانے میں کچھ طاقتور شخصیتیں ہی اول اول کام کیا کرتی ہیں۔ مگر جو قوم محض کسی شخصیت کے بل پر اٹھتی ہے وہ اس شخصیت کے ہٹتے ہی گر بھی جاتی ہے۔ اس کے قیام کو دوام اور اس کے ارتقاء کو استمرار اگر کوئی چیز بخش سکتی ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ اس

شخصیت کے سہارے اٹھنے کے بعد وہ کوئی ایسا نصب العین پالے جس کی کشش اسے ہمیشہ کھینچتی رہے، کوئی ایسا مقصد زندگی پالے جس کے عشق میں وہ پیہم سرگرم عمل رہے، اور کچھ ایسے اصول پالے جن کی بنیاد پر وہ اپنی حیات قومی کی عمارت مستحکم کر سکے۔ شخصیتیں بہرحال فانی ہوتی ہیں۔ ان کے بل پر قوم اٹھ تو سکتی ہے مگر قائم نہیں رہ سکتی۔ قائم رہنے کے لئے اسے ان چیزوں کی ضرورت ہے جن کی عمر اشخاص و افراد کی عمر سے زیادہ ہو، جو مردان کار کی موت کے ساتھ مر نہ جائیں بلکہ نسل بر نسل ان سے گرمی، حرکت اور طاقت پاتی چلی جائے۔

یہی بات تھی جو جنگ احد کے موقع پر قرآن مجید میں فرمائی گئی تھی کہ وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَاِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰٓى اَعْقَابِكُمْ۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو ایک پیغام کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے پیغام بر آ کر جا چکے ہیں۔ اگر وہ وفات پا جائیں یا شہید کر دیے جائیں تو کیا تم اپنی سابق جاہلیت کی طرف پلٹ جاؤ گے"؟ یعنی اگر تمہیں محض شخصیتِ محمد صلی اللہ علیہ سے وابستگی ہے تو تمہارا یہ شیرازہ محض وقتی اور عارضی ہے، ان کے ہٹتے ہی تم پھر پراگندہ ہو جاؤ گے اور اسی جاہلیت میں مبتلا ہو جاؤ گے جس سے نکل کر آئے تھے۔ لیکن اگر اس شخصیت کے ذریعہ سے تم نے ایک نصب العین، ایک مقصد حیات، اور ایک نظام زندگی پالیا ہے تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارا ثبات و قیام اس ذریعہ کی موجودگی پر ہی منحصر رہے۔ نہیں اس کے ہٹ جانے پر بھی تم اپنے اسی مقصد کے لئے جیو گے، اسی نصب العین کے لئے کام کرتے رہو گے، اور اسی نظام سے وابستہ رہو گے۔

قائد اعظم کی وفات کے بعد ہمارے لئے اب یہ سوال پہلے سے بھی بدرجہا زیادہ اہم ہو گیا ہے کہ آیا ہم کوئی ایسا مرکزی تخیل رکھتے ہیں جو ہمارے مختلف عناصر کے احزابی تخیلات پر غالب آ گیا ہو اور ان سب کو اپنی مقناطیسیت سے جوڑ کر ایک وحدت بنا سکتا ہو؟ آیا ہم کوئی ایسا اجتماعی مقصد رکھتے ہیں جو افراد اور قبائل اور خاندانوں اور طبقوں کے جداگانہ مقاصد کو کھا جائے اور یہ سب اس ایک بڑے مقصد کی خدمت میں اپنا تن من دھن سب کچھ لگا دیں؟ آیا ہم کچھ ایسی قدریں رکھتے ہیں جن کی طلب اور لگن ہمارے

بچے بچے کے دل میں پیدا ہو چکی ہو اور وہ ان کے حفظ و بقا اور نشو و ارتقاء کو اپنے نفس اور اس کی محبوب اور خواہشوں سے عزیز تر سمجھتا ہو؟ کیا ہم کچھ ایسے اصول رکھتے ہیں جن کے اتباع سے ہم اپنی حیاتِ قومی کو عدل و انصاف، تعاون و تناصر، امن و اطمینان اور ترقی و تقدم کی پائیدار بنیادوں پر قائم کر سکیں اور اُن اسباب کو مٹا سکیں جو ہمارے عناصرِ وجود کو آپس ہی کی کشمکش میں مبتلا کر دینے والے ہیں؟

یہ چیزیں اگر ہمارے پاس موجود ہیں تو ہمیں مطمئن رہنا چاہیے کہ پاکستان مستحکم ہے، محفوظ ہے، اور بقا و ارتقاء کی پوری طاقت رکھتا ہے۔ لیکن اگر دیانتہً ہم یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان چیزوں کا ہمارے اندر فقدان ہے، یا کم از کم اس حد تک قلت ہے کہ ان کی موجودگی سے کوئی خاص فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا، تو پھر ہمیں سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر یہ فکر ہونی چاہیے کہ انہیں پیدا کریں اور نشو و نما دیں، کیونکہ اب وہ شخصیت بھی باقی نہیں رہی ہے جس کی جاذب اور محرک طاقت ان کے فقدان کی کسی حد تک تلافی کر رہی تھی۔

مسلمانوں کی جگہ کوئی دوسری قوم ہوتی تو اس کے لئے یہ امر بجائے خود کافی پریشان کن ہوتا کہ وہ ایسا تخیل، ایسا مقصد، ایسی قدریں، ایسے اصول کہاں سے لائے۔ اس کو یہ ساری چیزیں کچھ خود تصنیف کرنی پڑتیں، کچھ جگہ جگہ سے مانگ تانگ کر لانی پڑتیں، اور انہیں اپنے اندر جذب کرنے کے لئے برسہا برس تک محنت کرنی پڑتی۔ لیکن مسلمانوں کے پاس اسلام کی شکل میں یہ سب کچھ موجود ہے، اور صدیوں کی روایات پہلے ہی اس کی جڑیں ہماری زندگی میں پھیلا چکی اور گہری اتار چکی ہیں۔ صرف ہماری غفلت ہے جس نے اسے مضمحل کر رکھا ہے، اور اسی کی بدولت ہم قوت و استحکام کے اس لازوال اور اتھاہ خزانے سے محروم ہو رہے ہیں۔ کیا اب بھی وقت نہیں آیا کہ ہم اس کی طرف توجہ کریں، اس کو تازہ کریں، اور اس کے ساتھ کبھی کبھار کے زبانی اشتغال پر قناعت کرنے کے بجائے بالفعل اس کو استعمال کریں؟

بلاشبہ بیرونی خطرات بھی ایک قوم کو متحد کر سکتا ہے، اس کے اندرونی اختلافات کو دبا سکتا ہے،

اس کی سوئی ہوئی طاقتوں کو بیدار کر سکتا ہے اور اس کے اندر بہت سے اُن اوصاف کو ابھار سکتا ہے جو تعمیر و استحکام کے لئے مددگار ہوتے ہیں۔ مگر یاد رکھنا چاہیئے کہ ڈر فی الحقیقت کوئی تعمیری طاقت نہیں ہے۔ وہ ایک وقتی چیز ہے۔ اس پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ہم انحصار نہیں کر سکتے۔ وہ ایک سلبی چیز ہے۔ اس سے ہمارے اندر وہ ساری قوتیں نہیں ابھر سکتیں جو اپنی حیات قومی کی تعمیر اور اس کے نشوونما کے لئے ہمیں مطلوب ہیں۔ وہ فائدے کے ساتھ مضرت کے پہلو بھی اپنے اندر رکھتا ہے۔ اگر صرف اسی پر ہماری تعمیر و استحکام کا مدار ہو تو ہم اپنے ہاتھوں اپنے اوپر ایک استبدادی نظام مسلط کر سکتے ہیں، اپنی فلاح و سعادت کے بہت سے گوشوں سے جان بوجھ کر غفلت برت سکتے ہیں، اپنی بہتری کے بہت سے کاموں کو ضائع کر سکتے ہیں، اور ان قوموں کی راہ پر پڑ سکتے ہیں جنہوں نے صرف بیرونی خطرات کے خوف پر اپنی زندگی کا مدار رکھا اور آخر کار اتنی تنگ، وہمی، چڑچڑی، بدمزاج ہو گئیں کہ انہوں نے خود اپنے رویہ سے اپنے لئے اُن خطرات کو واقعی مہلک بنا لیا جن سے وہ بچنا چاہتی تھیں پھر یہ حقیقت بھی نظر انداز نہ ہونی چاہیئے کہ بیرونی خطرات کے احساس سے جو زیادہ سے زیادہ اندرونی استحکام ممکن ہے وہ بھی زیادہ دیر تک ہمارے اندر اجتماعی عدل و انصاف کے نقدان کی تلافی نہیں کر سکتا۔ ہم خود اگر اپنے کسی بھائی پر ظلم کر رہے ہوں تو آخر کب تک وہ کسی بیرونی ظالم کے ڈر سے ہمارے ساتھ چمٹا رہیگا؟ ہماری شکم سیری، اپنے ایک بھائی کی فاقہ کشی کو آخر کتنی دیر تک اِس وعظ سے متاثر کر سکیگی کہ یہ پُرخطر وقت تجھ سے قربانیوں کا طلبگار ہے؟

پس بیرونی خطرات، جو فی الواقع موجود ہیں، اپنی حقیقی فطری حد تک ہی رہیں تو بہتر ہے۔ ایک استحکامی و تعمیری طاقت کی حیثیت سے محض انہی پر انحصار کر لینا درست نہیں ہے۔ اس غرض کیلئے تو ہمیں کوئی ایسی چیز چاہیئے جو دائمی اور مستقل ہو، جس کی قوتِ جاذبہ سے ہم جڑے جائیں۔ جس کی قوت محرکہ سے ہم متحرک ہو جائیں، جو ہماری تمام تعمیری قوتوں اور صلاحیتوں کو ابھار دے، اور جس کے فیض سے ہماری زندگی اپنے گھر میں بھی صالح ہو اور باہر والوں کے لئے بھی اسوۂ حسنہ بن جائے۔

دوسرا زبردست حادثہ جو ان دنوں ہماری قوم کو پیش آیا ہے وہ حیدرآباد کا سقوط ہے۔ اس معاملہ میں انڈین یونین اور اس کے لیڈروں نے جو شرمناک پارٹ ادا کیا ہے اس سے بحث کرنا ہمارے لئے لاحاصل ہے۔ ہندوستان میں اگر کچھ عقل و ہوش رکھنے والے لوگ موجود ہیں تو یہ دیکھنا ان کا کام ہے کہ ان کی قوم کدھر جا رہی ہے اور کہاں پہنچ کر رہیگی۔ ہم اپنی بحث کو معاملہ کے صرف اس پہلو تک محدود رکھینگے جس کا تعلق مسلمانوں سے ہے۔

حیدرآباد میں چند لاکھ ہندوستانی مسلمانوں کی ہجرت کے بعد مسلمانوں کی آبادی تقریباً چالیس لاکھ تھی۔ یہ چالیس لاکھ مسلمان ایک ایسی ریاست میں آباد تھے جس میں غیر مسلموں کی آبادی سوا کروڑ سے بھی زیادہ تھی۔ پھر اس ریاست کو چاروں طرف سے ایک ایسی مملکت گھیرے ہوئے تھی جس کی آبادی ۳۰ کروڑ سے زائد ہے اور جس میں حکمرانی اسی غیر مسلم اکثریت کی ہے جو خود ریاست میں بھی اکثریت ہی رکھتی ہے۔ والیٔ ریاست انہی والیان ریاست کی جنس سے تعلق رکھتا تھا جو اپنی گدی اور اپنے خانوادے کے مفاد کو بہرحال اپنی پوری قوم کی بہ نسبت عزیز تر رکھتے ہیں۔ فوج، پولیس اور نظم و نسق کے تمام شعبوں میں اگرچہ مسلمانوں کا غلبہ تھا، مگر غیر مسلم عنصر بھی کچھ ایسا بے اثر نہ تھا کہ حکومت کی انتظامی مشین کو بالکل مسلمانوں کی حمایت میں استعمال کیا جا سکتا۔ تقسیم ہند کے وقت تک ریاست پر انگریزوں کی بالادستی مسلط رہی تھی اور اس نے دوسری ریاستوں کی طرح حیدرآباد کو بھی ایسا کوئی موقع نہ دیا تھا کہ وہ اپنی فوجی طاقت مضبوط کر سکے۔ اور تقسیم کے بعد حیدرآباد انڈین یونین کے گھیرے میں آچکا تھا، اس لئے نہ باہر سے کوئی بڑی مدد اس کو پہنچ سکتی تھی اور نہ اندر ہی اس کا کوئی امکان تھا کہ چند مہینوں میں وہ اتنی جنگی طاقت فراہم کر سکے جو ہندوستان سے لڑنے کے لئے کچھ بھی کافی ہو۔ اخلاقی حیثیت سے بھی حیدرآباد کے مسلمان کچھ ایسے برتر نہ تھے کہ کوئی شخص یہ تصور کر سکتا کہ وہ اپنے سے ستر گنی طاقت کا مقابلہ کر سکیں گے۔ اور اس کا بھی کوئی امکان نہ تھا کہ پاکستان اپنے موجودہ حالات میں ان کی حمایت کے لئے اٹھ سکے

یہ تھے حیدرآباد کے اصل حالات۔ ان حالات میں کوئی ہوشمند انسان یہ امید نہیں کر سکتا تھا کہ وہاں

۵۰ فیصدی غیر مسلم اکثریت پر ۹۰ فیصدی مسلم اقلیت کا وہ غلبہ و اقتدار برقرار رکھا جا سکتا ہے جو پہلے بالکل مختلف حالات میں قائم ہوا اور رہا تھا۔ اور کسی مرد عاقل سے یہ بات بھی چھپی نہیں رہ سکتی تھی کہ حیدر آباد انڈین یونین سے لڑ کر اس کے علی الرغم اپنی خود مختاری قائم نہیں رکھ سکتا۔ دانشمندی کا تقاضا یہ تھا کہ مسلمان کشمکش، مزاحمت اور جنگ کے بجائے اپنے مستقبل کے لئے کوئی ایسی راہ تلاش کرتے جس میں وہ کامل تباہی سے بچ بھی سکتے اور آئندہ اپنی اخلاقی و دینی حالت کو بہتر بنا کر کوئی نتیجہ خیز جد و جہد کرنے کے مواقع بھی انھیں حاصل رہتے۔ لیکن جن لوگوں نے ایسی کوئی راہ سوچی اور بتائی وہ مسلمانوں کو دشمن نظر آئے۔ انہوں نے اپنی رہنمائی کے لئے ایسے لوگوں کو پسند کیا جو اندھے جوش، کھوکھلے نعروں، جھوٹی توقعات، غلط امیدوں، بے بنیاد آرزوؤں، اور بے زور لاف و گزاف کے ذریعہ سے ان کے غرور نفس کو فی الوقت تسکین دے سکیں۔ وہ اس آواز پر مرمٹے کہ کوئی دلی کے لال قلعہ پر آصف جاہی جھنڈا گاڑ دینے کی بات تو کرتا ہے۔ اس نشے میں چالیس لاکھ کی پوری آبادی مست ہو گئی۔ کوئی یہ سوچ کر اپنے وقتی لطف کو کرکرا کرنے پر راضی نہ ہوا کہ آخر یہ کام ہو گا کس طرح؟ سب کے سب آنکھیں بند کر کے اس لاف زنی کے پیچھے چل پڑے اور اپنی قسمت پر ناز کرنے لگے کہ اس گئے گزرے زمانے میں بھی انہیں ایسے بے نظیر لیڈر میسر آنے ہی چلے جاتے ہیں!

یہ تو تھی حیدر آباد کے مسلمانوں کی کیفیت۔ رہے پاکستان کے مسلمان تو ان کی کیفیت بھی اُن سے کچھ مختلف نہ تھی۔ سیاسی تقسیمات نے چاہے ہم کو کتنا ہی بانٹ دیا ہو، مگر قوم اور اس کا مزاج تو ایک ہی ہے۔ یہاں ہمارے اخبارات وہ ساری نشہ آور تقریریں پھیلا رہے تھے جن سے حیدر آباد کے لوگوں پر سُنی کا عالم طاری کیا جا رہا تھا۔ حیدر آباد کی روز افزوں طاقت اور اس کی زبردست تیاریوں کے متعلق طرح طرح کے افسانے نہ معلوم کہاں تصنیف ہوتے تھے اور عام لوگوں تک پہنچا دیے جاتے تھے۔ کبھی ہمیں سُنایا جاتا تھا کہ حیدر آباد کے پاس بڑا بھاری ہوائی بیڑہ موجود ہے۔ کبھی کہا جاتا تھا کہ اس نے گوآ کی بندرگاہ حاصل کر لی ہے۔ کبھی خبر دی جاتی تھی کہ اس نے فرانس سے ایک جزیرہ حاصل کر لیا ہے۔ کبھی اس کی فوجی طاقت اور جنگی سر و سامان کے متعلق سراسر بے سر و پا

اندازے شائع کئے جاتے تھے۔ کبھی بتایا جاتا تھا کہ دنیائے اسلام کے گوشے گوشے میں اس کی مدد کے لئے تیاریاں ہو رہی ہیں۔ ان باتوں سے محض عوام الناس ہی نہیں، ہمارے اچھے خاصے تعلیم یافتہ لوگ اور ذمہ دار منصب رکھنے والے اصحاب تک جھوٹی اُمیدوں اور غلط توقعات کے قلعے بنا کر بیٹھ گئے تھے۔ حتیٰ کہ جس روز شام کو حیدر آباد ہتھیار ڈالنے والا تھا اس کی دوپہر تک ہمارے خطیب اپنے جمعہ کے خطبوں میں اپنی قوم کو یہ یقین دلائے جارہے تھے کہ عنقریب لڑائی کا نقشہ بدلنے والا ہے اور اس کے بعد...... بس دیکھنا کہ کیا ہو جائیگا۔ پھر جب تلخ حقائق کی ایک ضرب نے وہ تمام خیالی قلعے یک لخت منہدم کردئے جو ہوا باندھ کر پچھلے ایک سال سے تعمیر ہو رہے تھے، تو اس کا نفسیاتی اثر جو کچھ ہوا وہ سب کو معلوم ہے۔

آج حیدر آباد میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کے تصور سے ہر مسلمان کا دل غمگین ہے۔ جہاں سات آٹھ سو برس تک مسلسل مسلمانوں کا غلبہ رہا آج وہاں مسلمان صرف مغلوب ہی نہیں پامال ہو رہے ہیں۔ ہندوستان کی وسیع سرزمین پر وہ ایک خطہ بھی اب باقی نہیں رہا جہاں مسلمان عزت سے سر اٹھا کر چل سکتا تھا۔ کل تک جس حیدر آباد کی طرف سارے ہندوستان کے مسلمان اُمید بھری نگاہوں سے دیکھا کرتے تھے، افسوس! آج وہی حیدر آباد ہر طرف مایوسی ہی مایوسی دیکھ رہا ہے۔ اس کے عزت والے ذلیل ہو رہے ہیں۔ اس کے بہترین نوجوان ضائع کئے جارہے ہیں۔ اور اس کی طاقت اس طرح توڑی جارہی ہے کہ شاید چند سال بعد ہندوستان میں کسی خطے کے مسلمان اتنے خستہ حال نہ ہونگے جتنے حیدر آباد کے مسلمان۔

اپنے بھائیوں کے اس انجام پر ہمارا غم و افسوس صحیح۔ انڈین یونین کی بدعہدیوں اور کم ظرفیوں اور خرمستیوں پر ہمارا غصہ بجا۔ برطانوی حکومت کے غدارانہ رویہ پر ہماری شکایت درست۔ اور نظام کی خود غرضی پر بھی ہمارا غیظ و غضب برحق۔ مگر ہم کبھی اس طرح کی ٹھوکریں کھانے اور چوٹیں سہنے سے نہیں بچ سکیں گے جب تک کہ خود اپنی اُن غلطیوں کو محسوس نہ کریں جن کی بدولت یہ پے در پے

رکیں ہمیں اٹھانی پڑ رہی ہیں۔ ہم حقائق سے منہ موڑ کر آرزوؤں اور تمناؤں کے پیچھے چلتے ہیں۔ ہم عقل کی بات بتانے والوں کو دشمن اور خوش کن باتیں بنانے والوں کو دوست سمجھتے ہیں۔ ہم ٹھوس عمل کی کمی کو خیالی ہواؤں سے پورا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہم نصیحت سے نفور اور کذب و فریب کے قدرداں ہیں۔ ہم کسی کو اپنے آگے لگاتے وقت اس کے اخلاقی و ذہنی اوصاف نہیں دیکھتے بلکہ صرف یہ دیکھتے ہیں کہ وہ نعرہ کتنے زور کا لگاتا ہے اور زبان کے استعمال میں کس قدر مطلق العنان ہے۔ ہم اپنے رہبروں اور سربراہ کاروں کے انتخاب میں پیہم غلطیاں کرتے رہے ہیں اور اندھی پیروی کے اتنے خوگر ہو چکے ہیں کہ تباہ کن حوادث میں مبتلا ہونے سے پہلے کبھی آنکھیں کھول کر نہیں دیکھتے کہ ہمارے رہبر ہمیں کدھر لئے جا رہے ہیں۔ ہماری یہی کمزوریاں دراصل ہماری سب سے بڑی دشمن ہیں۔ کسی باہر والے کی دشمنی اور کسی گھر والے کی غداری ہمارا کچھ نہ بگاڑ سکتی اگر ہماری اپنی یہ کمزوریاں اس کی مدد نہ کرتیں۔ اب بھی ہم انہیں سمجھ لیں اور ان کی اصلاح پر آمادہ ہو جائیں تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ حیدر آباد کا خون رائگاں نہ گیا۔ لیکن افسوس کہ سقوط حیدر آباد کے بعد فوراً ہی ہم نے اس کی ایسی توجیہات شروع کر دیں جن سے اپنی کمزوریوں کے سوا ہر دوسری ممکن التصور چیز پر اس حادثۂ عظیم کی ذمہ داری ڈالی جا سکے۔ گویا ہم اپنے نفس کو یہ اطمینان دلانا چاہتے ہیں کہ ہم خود تو سب کچھ ٹھیک ہی کر رہے تھے، صرف فلاں کی غداری اور فلاں کی بے وفائی نے ہم کو اس حادثہ سے دوچار کر دیا ـــــ درحقیقت یہ وہ افیون کی گولیاں ہیں جو ہر چوٹ کے بعد ہم اس لئے کھایا کرتے ہیں کہ ہمیں اپنی خامیوں کا تلخ احساس نہ ہونے پائے!

قدیم زمانے میں اقتدار و اختیار کا مرکز بادشاہ ہوتے تھے اور اجتماعی زندگی کے سارے کارخانے کی درستی یا خرابی کا انحصار اس پر ہوتا تھا کہ وقت کا بادشاہ کیسا ہے۔ بادشاہ عقلمند اور نیک مزاج ہوتا تو وہ اپنے گرد و پیش اچھے مشیر، راستباز علماء، دانشمند مدبر، اور دیانتدار کارکن جمع کر لیتا تھا اور سب کام ٹھیک چلتے تھے۔ لیکن اگر تخت شاہی پر کوئی بگڑا ہوا شاہزادہ متمکن ہو جاتا تو اسے

خوشامدی مصاحب ہر طرف سے گھیر لیتے تھے اور وہ اسے بھروں پر چڑھا کر غلطیوں کے چکر میں ایسا پھانستے تھے کہ صرف شاہی خاندان ہی نہیں بلکہ پوری مملکت تباہی و بربادی کی راہ پر چل پڑتی تھی۔ سلطنت کمزور ہوتی تھی اور وہ بادشاہ کو یقین دلاتے تھے کہ حضور کی طاقت آسمان پر جا رہی ہے۔ دشمن سر پر ہوتا تھا اور وہ بادشاہ کو اطمینان دلاتے تھے کہ حضور کا اقبال سب کا مُنہ پھیر دیگا۔ بادشاہ کے کانوں تک وہ کوئی صحیح رائے، کوئی نیک مشورہ، اور کوئی حق بات نہ پہونچنے دیتے تھے۔ دربار میں مانگ ہی ان لوگوں کی ہوتی تھی جو بادشاہ کو دھوکے اور فریب میں مبتلا رکھیں، اس کو جھوٹ سے خوش کریں، اس کی کمزوریوں کو خوبیاں بتائیں، اس کے گناہ کو صواب ٹھیرائیں، دنیا کی ساری حقیقتوں کو اس کی خواہشات کے مطابق ڈھالیں اور کسی تلخ حقیقت سے اس کے عیش کو بدمزہ نہ ہونے دیں۔ اس ماحول میں کوئی ناصح مشیر، کوئی حق گو عالم، کوئی دوراندیش اور معاملہ فہم انسان اور کوئی مخلص و متدین ملازم بادشاہ کے پاس نہ پھٹک سکتا تھا، اور اگر اتفاق سے کوئی ایسا آدمی نکل بھی آتا تو بداندیشوں کی پوری ٹولی مل کر اپنا سارا زور اس کے خلاف لگا دیتی تھی تاکہ بادشاہ کا مزاج اُس پر برہم ہو جائے اور اسے دربار سے نکال باہر کیا جائے۔ پھر جب یہ ساری خرابیاں مل جل کر سلطنت پر کوئی بڑی آفت لے آتیں تو افیون کے بہت سے انٹے اور شراب کے ساغر اور بھنگ کے پیالے تیار رکھے جاتے تھے تاکہ اعلیٰ حضرت کی آنکھیں کھلنے سے پہلے انہیں غفلت میں سرشار کر دیا جائے۔

آج اس جمہوریت کے دور میں عوام کا وہی مقام ہے جو پہلے بادشاہوں کو حاصل تھا۔ اقتدار و اختیار کا منبع اب بادشاہ نہیں، ملک کے عوام ہیں۔ زندگی کا سارا نظام اسی وقت ٹھیک چل سکتا ہے جبکہ عوام الناس کا شعور درست ہو، ان میں بھلے اور برے کی تمیز ہو، اور وہ ٹھیک ٹھیک سمجھیں کہ کس پر اعتماد کرنا چاہیے اور کس پر نہ کرنا چاہیے۔ یہ بات جہاں نہ ہو گی وہاں وہی صورت حال رونما ہو گی جو پہلے شخصی بادشاہی کے دور میں کسی بگڑے ہوئے شاہزادے کے تخت نشین ہونے پر رونما ہوا کرتی تھی۔ اب مصاحبوں کا زمانہ نہیں ہے، ان کی جگہ اب گمراہ کن اخباروں اور بے لگام خطیبوں اور الکشن کے کھلاڑیوں اور دنیا پرست مولویوں نے لے لی ہے۔ پہلے بگڑے ہوئے عوام ان کو پسند کر کے ابھارتے ہیں، پھر یہ ابھر کر عوام کو اور زیادہ بگاڑتے چلے جاتے ہیں۔